ملفوظاتِ اقبال

(علّامہ اقبال سے ملاقاتیں)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

Several collections based on the accounts of Allama Iqbal's meetings have been published. But there are still many details of Allama Iqbal's meetings which are not included in the published collections. These include the meetings of Mulla Wahidi, Ehsan Danish and Qazi Abdul Majeed Qureshi. There is only one letter of Mulla Wahidi in the name of Allama Iqbal. But the details about his meetings with Allama Iqbal have been published in an academic journal. Ehsan Danish published the details of his meeting with Allama Iqbal in his book Jahan Danish. Qazi Abdul Majeed Qureshi also met Allama Iqbal. Details of meetings have been published. This article provides details of meetings not included in published collections of Allama Iqbal's meetings.

علّامہ اقبال سے ملاقاتوں کے احوال پر مبنی متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ ملفوظاتِ اقبال، مرتّب: محمود نظامی۔ اشاعت منزل، لاہور [۱۹۴۹ء]

۲۔ اقبال کے ہم نشیں، مرتّب: صابر کلوروی۔ مکتبہ خلیل لاہور، ۱۹۸۵ء

۳۔ مجالسِ اقبال، مرتّب: جعفر بلوچ۔ دارالتّذکیر لاہور، ۲۰۰۲ء

ذیل میں علّامہ سے ملاقاتوں کی روداد پر مبنی چند تحریریں پیش کی جارہی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل نہیں ہے۔

(۱)

علّامہ اقبال: ملّا واحدی

ملّا واحدی (۱۷ مئی ۱۸۸۸ء- ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء) اصل نام محمد ارتضیٰ۔
معروف اخبار نویس اور صاحبِ طرز انشا پرداز۔ انھیں "ملّا واحدی" کا خطاب ان کے دوست خواجہ حسن نظامی نے دیا تھا۔ ملّا صاحب نے تقسیمِ ہند سے پہلے رسالہ درویش اور پھر ماہنامہ نظام المشائخ جاری کیا۔
قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ ان کی بعض تصانیف یہ ہیں:
۱۔ حیاتِ سرورِ کائنات ﷺ، حصّہ اوّل، ۱۹۵۲ء، ۲۔ حیاتِ سرورِ کائنات ﷺ، حصّہ دوم، ۱۹۵۷ء، ۳۔ میرے زمانے کی دلی، ۱۹۵۶ء، ۴۔ سوانح حسن نظامی، ۱۹۵۷ء، ۵۔ تاثّرات (علمی و ادبی مضامین)، ۶۔ حیاتِ اکبر الہ آبادی، ۷۔ دلی کا پھیرا، ۸۔ بزمِ فرید (ملفوظات بابا فرید الدین گنج شکر)، ۹۔ ناقابل فراموش لوگ، ناقابل فراموش باتیں۔
علّامہ اقبال کے نام ان کا صرف ایک خط ملتا ہے۔ دیکھیے: خطوطِ اقبال، خط نمبر ۱۵۔

علّامہ اقبال اُس زمانے میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کہلاتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی[۱]، شیخ عبدالقادر[۲] اور شیخ محمد اقبال کو "شیخین پنجاب" کہا کرتے تھے۔
علّامہ اقبال سے میری پہلی ملاقات مسلم ہائی سکول انبالہ کے افتتاح کے موقعے پر ہوئی تھی۔ مجھے اور خواجہ صاحب کو میر نیرنگ[۳] نے بُلایا تھا۔ وہ بانیانِ اسکول میں تھے۔ علّامہ اقبال پٹیالے سے آئے تھے۔ پٹیالے میں نواب ذوالفقار علی خان وزیر اعظم[۴] تھے۔ علّامہ اقبال اُن کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ آتے ہی علّامہ اقبال نے خواجہ صاحب سے فرمایا: "خواجہ صاحب، ذوالفقار نے تاکید کر دی ہے کہ اکیلے واپس مت آنا، خواجہ حسن نظامی کو ساتھ لے کر آنا۔"
خواجہ صاحب نے میری معذوری بتائی کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کے گارجین ہیں۔ انھیں فلاں تاریخ کو ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں جائداد کی آمدنی و خرچ کا حساب پیش کرنا ہے۔ علّامہ اقبال نے ڈسٹرکٹ جج، دِلّی کے نام تار بھیج دیا اور تاریخ بدلوا دی۔ پھر میں اور خواجہ صاحب سات، آٹھ دن نواب ذوالفقار علی خاں کے ہاں دن رات علّامہ اقبال کی صحبت میں رہے۔ علّامہ اقبال نہایت سادہ مزاج اور بے تکلف انسان تھے۔ سات، آٹھ ہی دن میں انھوں نے مجھے یہ بچگانہ اور گستاخانہ سوال کرنے کی جرأت

بخش دی کہ:" ڈاکٹر صاحب ،کیا بات ہے، آپ جیسا لکھتے ہیں، ویسا بولتے نہیں"۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال پر منہ نہیں بگاڑا۔ میری طرف سے رُخ نہیں پھیرا بلکہ ہنس کر فرمایا:"جتنی محنت لکھنے میں کرنی پڑتی ہے، اتنی بولنے میں بھی کرنے لگوں تو دیوانہ ہوجاؤں۔ بولتا مَیں انگریزی بھی بے پروائی سے ہوں مگر لکھتے وقت انگریزی اور اردو کے الفاظ کو اِس طرح تراشتا ہوں جس طرح شیشے سے نگینہ تراشا جاتا ہے۔"

میں علّامہ اقبال سے لاہور کی پرانی انارکلی میں بھی ملا تھا، جہاں اُن کا وکالت کا دفتر تھا۔[۵] اُن دنوں شیخ عبدالقادر بھی کہیں نزدیک ہی رہتے تھے۔ دہلی سے واپس آ چکے تھے۔ علّامہ اقبال نے شیخ عبدالقادر کو اپنے دفتر بلوالیا تھا۔ میں اور خواجہ صاحب ،غلام غوث صمدانی کی شادی سے فارغ ہوکر کھڑے کھڑے جالندھر سے شیخینِ پنجاب سے ملنے لاہور چلے گئے۔ شام تک چاروں دفتر کے کمرے میں بیٹھے۔ شام کو شیخینِ پنجاب نے اسٹیشن پہنچا دیا اور خدا حافظ کہا"۔ (مسٹر غلام صمدانی، اس زمانے میں علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے۔ پھر بہاول پور میں اسسٹنٹ انجینئر رہے، اب ماڈل ٹاون ،لاہور میں رہتے ہیں۔ مجھ سے خط و کتابت ہے۔)

اس کے بعد میری ملاقات علّامہ اقبال سے ہمیشہ اپنے ہی گھر پر ہوئی۔ ایک دفعہ وہ میرے ہاں مہمان بھی رہے تھے۔ ویسے دہلی کا پھیرا کرتے تھے، تو میرے ہاں تو آتے ضرور تھے۔

----تحریر: علمی مجلس ،دہلی کا تماہی رسالہ نمبر ۴۵ ،جنوری تا ستمبر ۱۹۷۸ء، مرتّب: مالک رام۔

(۲)

علّامہ اقبال کے گھر: احسان دانش

احسان دانش (۱۹۱۴ء-۱۹۸۲ء۔ اصل نام: قاضی احسان الحق) معروف اردو شاعر، ادیب اور ماہر لسانیات و عروض۔ نہایت خوددار انسان تھے۔ کثیر تعداد میں نو آموز شاعروں نے احسان دانش کا تلمذ اختیار کیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے انھیں ستارۂ امتیاز اور نشانِ امتیاز عطا کیا۔ ان کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ حدیثِ ادب، ۲ ۔ دردِ زندگی، ۳۔ آتشِ خاموش، ۴۔ چراغاں، ۵۔ زخم ومرحم، ۶۔ میراثِ مومن (۱۹۶۸ء)، ۷۔ جادۂ نو، ۸۔ نفیرِ فطرت، ۹۔ نوائے کارگر، ۱۰۔ شیرازہ، ۱۱۔ فصلِ سلاسل، ۱۲۔ زنجیرِ بہاراں، ۱۳۔ دارین (۱۹۷۴ء)، ۱۴۔ ابرِ نیساں (۱۹۹۹ء)، ۱۵۔ جہانِ دانش (خود نوشت، اوّل)، ۱۶۔ جہانِ دانش (خود نوشت، دوم)،

۱۷۔لغات الاصلاح، ۱۸۔ رموزِ غالب (شرح دیوانِ غالب)، ۱۹۔ اردو تذکیر و تانیث، ۲۰۔ خضرِ عروض (علمِ عروض)، ۲۱۔ ابلاغِ دانش، ۲۲۔ آواز سے ابلاغ تک، ۲۳۔ اردو مترادفات۔

مولانا تاجور[۶]، علامہ اقبال کے مدّاحوں میں سے تھے اور کہا کرتے تھے کہ: "پنجاب کی سرزمین نے یہ بہت تن آور انسان پیدا کیا ہے، لیکن یہاں کی پبلک کے دماغ ابھی اونگھ رہے ہیں"۔ یہاں اس یگانۂ روزگار کے لیے بھوپال کے تین سو روپے ماہانہ کے وظیفے کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اقبال کی زندگی کے لیے یہ بہت ہے۔[۷] ہاں قوم اور اس کے نشوونما کا تصوّر سرے سے مفقود ہے۔"

ایک دن میں نے عرض کی: "مولانا، زندگی میں جس قدر اقبالؔ کی شہرت ہے، یہاں اور کس کو یہ رُتبہ مِلا ہے؟ مولانا تُنک مزاج تو تھے ہی، بگڑ گئے جیسے ان کی خموشی کے پھوڑے کو چھیڑ دیا ہو۔ بولے: "اَبے اُلّو، تجھے کیا خبر کہ علّامہ اقبال کس مقام کے انسان ہیں۔ یہاں ایسی شخصیتوں کے جوہر تو مرنے کے بعد کُھلا کرتے ہیں کیونکہ مُردہ قومیں مُردوں کو پوجتی ہیں اور زندہ قومیں زندہ لوگوں کے جوہر کو سراہتی ہیں۔"

میں نے مولانا سے کئی بار کہا: "مولانا! مجھے علّامہ اقبال کو دکھا تو دیں، آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔" مولانا نے کہا: "ہرگز نہیں، میں تجھے اپنے ساتھ ہرگز نہیں لے جاسکتا کسی اَور کے ساتھ بھیج دوں گا، دیکھ آنا۔"

مَیں نے کہا: "مولانا، میں تو آپ ہی کے ساتھ جاؤں گا، آپ سے زیادہ یہاں میرا ہمدرد کون ہوسکتا ہے؟"

مولانا بولے: "تو بڑا بے ادب اور مُنہ پھٹ آدمی ہے، تجھے ساتھ لے جا کر مَیں کیا اپنی توہین کراؤں؟"

مَیں نے نہایت لجاجت سے کہا: "مولانا، مَیں وعدہ کرتا ہوں جب تک وہاں سے واپس آئیں گے، اُس وقت تک میں ہونٹ سیے رہوں گا، ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالوں گا۔" مولانا سُن کے خاموش ہوگئے۔

ایک دن مولانا نے مجھے گھر سے بلوایا اور کہا: "ذرا کپڑے ڈھنگ کے پہن آ۔"

مَیں نے پوچھا: "کیا گورنر صاحب کے یہاں جانا ہے؟

"علّامہ اقبالؔ کے یہاں جانا ہے، علّامہ اقبال کے، جس کے لیے تو روز میرے سر رہتا ہے۔"

مَیں: "مولانا، اُنھیں میرے کپڑوں سے کیا غرض، وُہ تو آپ کو دیکھیں گے، آپ اپنے مقام کا لباس پہن لیں۔ مَیں تو آپ کے خادم کی حیثیت سے آپ کے ساتھ جاؤں گا اور میرے پاس کپڑے ہیں بھی

کہاں۔ دو جوڑے ابھی دھو کے سوکھنے کے لیے ڈال آیا ہوں، وہ بھی کئی جگہ سے گونتھ رکھّے ہیں۔"

مولانا: "اچھا، چل یونہی چل، لیکن جب تک وہاں رہے، زبان سی لینا زبان۔"

مَیں: "جیسا حکم ہو، میری کیا مجال کہ سرتابی کروں۔"

اِس کے باوجود مولانا تمام راستے مجھے تلقین کرتے گئے کہ: "وہاں زبان کھولنا گستاخی ہے، گستاخی۔"

جب مولانا، علّامہ کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچے تو مولانا نے پھر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور مَیں تیوری پر بَل ڈال کر خاموش ہوگیا۔

مولانا نے جھلاّ کے کہا: "کُچھ مُنہ سے تو پھوٹ، سُن رہا ہے کہ نہیں؟"

مَیں: "آپ ہی نے تو کہا ہے کہ خاموش رہنا۔ مَیں تو بڑی دیر سے خاموشی سے عمل پیرا ہوں۔"

مولانا مسکراتے ہوئے علّامہ کے یہاں ایک نیم روشن کمرے میں پہنچ گئے۔

مولانا تاجورؔ اور علّامہ تو باتیں کرتے رہے اور میں اُن دونوں بزرگوں کو ایک پجاری کی طرح دیکھتا رہا۔

جب چلنے لگے تو علّامہ نے مولانا سے میرے متعلّق دریافت کیا تو مولانا نے فرمایا: "غریب مزدور آدمی ہے۔ نہ جانے شعروشاعری کا روگ کہاں سے لگا لیا اور میرے یہاں آنے جانے لگا۔ عرصے سے آپ کو دیکھنے کا متمنّی تھا۔"

علّامہ نے میرا نام دریافت کیا۔ مَیں نے شرمائے ہوئے لہجے میں کہا: "احسانؔ۔" علّامہ نے فرمایا: "نام تو مزدوروں والا نہیں، اچھا! خُدا اِسم بامسمّٰی کرے"۔

مولانا جب سڑک پر آئے تو کہنے لگے: "احسان، تُو نے بڑے آدمی کو دیکھا ہے"۔ مَیں نے عرض کی: "حضور، میں بلاشبہہ آپ کا ممنُون ہُوں۔"

مولانا: "مَیں نے تجھے اسی لیے خاموش رہنے کو کہا تھا کہ تو بات نہ کرنا جانتا ہے اور نہ سُننا، بھلا مجھے تیری ممنونیّت سے کیا فائدہ؟"

مَیں نے کہا: "مولانا، شکریہ کوئی جُرم تو نہیں"۔

مولانا نے کہا: "چُپکا چُپکا چل، بات نہ بڑھا، مَیں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ تو خوش نصیب ہے کہ علّامہ سے مل بھی لیا اور دُعا بھی لے لی۔"

——— جہانِ دانش، جلد دوم: احسان دانش۔ خزینۂ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۲ء

(۳)

ایمان کی تلاش: قاضی عبدالمجید قریشی

(قاضی صاحب وقتاً فوقتاً علّامہ اقبال سے ملاقات کے لیے ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ حسبِ ذیل مضمون میں انھوں نے ۲۸ اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۰ء کی ملاقاتوں کا احوال قلم بند کیا ہے۔ ذیل میں ان ملاقاتوں کی روداد دی جارہی ہے۔)

"۲۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو راقم الحروف (حضرتِ علّامہ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ حقہ سامنے رکھا تھا۔ رسمی مزاج پرسی ہوئی اور اس کے بعد تبلیغِ اسلام کے عنوان پر گفتگو شروع ہوگئی۔

"آپ ایک کتاب لکھیے۔" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"کیسی کتاب؟" میں نے پوچھا۔

"تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندُستان کے قصبات اور دیہات میں ہزار ہا غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص اِن ازخود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبولِ اسلام کی وجوہات دریافت کر کے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اِس سے تبلیغِ اسلام کے مقصد کو بے حد تقویت حاصل ہوگی۔"

"کیا صداقت اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت ہیں مگر ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے۔ دماغ اکثر اوقات ہزار ہا مضبوط سے مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن دل اس کے برخلاف، بعض کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متأثّر ہوجاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ قبولِ اسلام کا جس قدر تعلق دل سے ہے، دماغ سے نہیں۔

اصل بات جو مبلّغ کو معلوم ہونی چاہیے، یہ ہے کہ کون کون سے نشتر ہیں جن سے دل متأثّر ہوا کرتے ہیں؟ کفّار اور مشرکین کے انقلابِ حیات کی ہزار ہا مثالیں تاریخِ اسلام میں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے ماتحت، ایک خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے، ناگہاں غیب سے اس کے دل پر ایک نشتر چلتا ہے اور چشمِ زدن میں اس کی زندگی کی تمام گذشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقتِ اسلام کے عقلی دلائل تو آپ کے پاس بہت ہیں، مگر قلبی دلائل بہت کم ہیں۔ اگر آپ نومسلمانوں

کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام کی وہ کون سی بے ساختہ ادا تھی جو اُن کے دل کو بھا گئی۔ اگر ان کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دیے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انقلابِ حیات کی ایک بالکل نئی دنیا، مبلغینِ اسلام کے سامنے آجائے گی اور انھیں اشاعتِ اسلام کے لیے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے کہ ان سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو بھی کوئی واقعہ یاد ہے؟"

ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر چپ رہے۔ اس پر میں نے عرض کیا:

"آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی مگر اسلام کی خدمت ہو جائے گی۔ آپ تکلیف کر کے ضرور ارشاد فرمایئے۔" میں نے التماس کی۔

ڈاکٹر صاحب نے بیان کرنا شروع کیا: لیڈی بارنس کا قبولِ اسلام عجیب واقعہ ہے۔ آپ ایک نومسلم انگریز فوجی کی بیوی تھیں۔ چند سال کا ذکر ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی ایک مقدمے میں مبتلا ہو گئے اور اس سلسلے میں میرے پاس آئے۔ چونکہ الزامات درست نہیں تھے، اس لیے عدالت نے ان دونوں کو عزت کے ساتھ بری کر دیا۔ اس کے چند روز بعد لیڈی بارنس میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے لاہور تشریف لائیں۔ اس وقت میں نے سوال کیا: "لیڈی صاحبہ آپ کے مشرّف بہ اسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں؟"

"مسلمانوں کے ایمان کی پختگی، ڈاکٹر صاحب!" لیڈی بارنس نے جواب دیا۔

"لیڈی صاحبہ! میں نہیں سمجھا۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں نے دیکھا کہ دنیا میں کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جس کا مسلمانوں کی طرح ایمان پختہ ہو۔ بس، اس چیز نے مجھے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا ہے۔"

لیڈی بارنس نے اپنا نظریہ بیان کر کے تھوڑا تامّل فرمایا اور کہا: "ڈاکٹر صاحب! میں ایک ہوٹل کی مالکہ تھی۔ یہیں ایک دفعہ میجر صاحب کھانے کے لیے آئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہماری گفتگوئیں جاری رہیں اور اس کے بعد میری ان سے شادی ہوگئی۔

میرے ہوٹل میں ایک ستّر سالہ بڈّھا مسلمان ملازم تھا۔ اس بڈّھے کا فرزند نہایت خوب صورت تھا۔ پچھلی بیماری میں جب یہ لڑکا چل بسا تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ اس بڈّھے کے پاس تعزیت کے لیے گئی۔ اُسے تسلی دی اور دلی رنج وغم کا اظہار کیا۔ بڈّھا نہایت غیر متأثّر حالت میں میرے الفاظ سنتا رہا اور میں غم کی باتیں ختم کر چکی تو اس نے نہایت شاکرانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا: "میم صاحب! یہ خدا کی تقدیر ہے۔ خدا کی امانت تھی، خدا لے گیا۔ اس میں غمزدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ ہمیں تو ہر حال میں خدائے غفور کا شکریہ ادا کرنا ہے۔"

لیڈی بارنس اتنا کہہ کر رُک گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس نے کوئی نہایت ہی عجیب معجزہ بیان کیا ہے اور اب وہ زبانِ حال سے مجھ سے یہ مطالبہ کر رہی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ مل کر حیرت کا اظہار کروں۔

میں نے کہا: "لیڈی صاحبہ! پھر؟"

لیڈی نے اپنا قصہ شروع کیا اور کہا:

"ڈاکٹر صاحب! بڈّھے کا آسمان کی طرف انگلی اٹھانا ہمیشہ کے لیے میرے دل میں پیوست ہوگیا۔ میں بار بار اس کے الفاظ پر غور کرتی تھی اور حیران تھی کہ الٰہی، اس دنیا میں اس قسم کے صابر، شاکر اور مطمئن دل بھی موجود ہیں؟ مجھے بڑی کاوش یہ تھی کہ بڈّھے نے ایسا پُر استقامت دل کیسے پایا؟ اسی غرض سے میں نے پوچھا: کیا مرحوم کے اہل وعیال بھی تھے؟ وہ کہنے لگا: "ایک چھوٹا بچہ اور ایک بیوی ہے۔" بڈّھے کے اس جواب نے میری حیرت کو کم کر دیا۔

میں نے بڈّھے کی اطمینانِ قلب کی یہ تاویل کی کہ چونکہ پوتا موجود ہے، اس واسطے، وہ اس کی زندگی اور محبت کا سہارا ہوگا، لیکن ڈاکٹر صاحب میں نے اس تاویل سے اگرچہ اپنے دماغ کو پرچا لیا مگر میرے دل کو اطمینان نہ ہوا اور میں برابر پڑتال میں لگی رہی کہ کسی طرح اپنے بڈّھے ملازم کے دل کی صحیح کیفیت سمجھوں۔

واقعے کے تھوڑے دن بعد یتیم بچے کی ماں بھی چل بسی۔ اس سے میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ بڈّھے کی بہو کا غم میری عقل پر چھا گیا مگر اسی وقت میری وہ قدیم تڑپ بھی جاگ اٹھی اور میں نے خیال کیا کہ بڈّھے کے امتحان کا اصل وقت یہی ہے۔ میرے دل پر اس کی طویل خدمت گزاریوں کا اثر تھا۔ اس کے نوجوان فرزند کے بعد اب اس کی بیوی کی موت اور اس کے پوتے کی یتیمی نے اس اثر کو اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا لیکن اس فطری اور رسمی ہمدردی اور دلسوزی کے علاوہ اصل چیز جو میری دلچسپیوں کا حقیقی مرکز تھی، یہ تھی کہ میں بڈّھے کی کیفیتِ قلب کا صحیح اندازہ کروں؟

دوسرے دن بڈّھے کے گاؤں کو (جو بالکل قریب ہی تھا) روانہ ہوئی۔ اس وقت تک جذبات و تخیلات کی ایک بے تاب کائنات میرے ہمرکاب تھی۔ میں ہر ایک قدم پر یہ خیال کرتی تھی کہ اس تازہ مصیبت نے بڈّھے کے دل کی حالت کو بدل دیا ہوگا۔ وہ کبھی اپنے ضعف اور حالِ زار پر غور کرتا ہوگا اور غم میں ڈوب جاتا ہوگا مگر دوسرے ہی قدم پر یہ سوچنے لگتی، جب اس کا معصوم، کمسن اور لاوارث پوتا ماں باپ کے فراق میں بلبلائے گا تو وہ کس طریقے سے اُس کے اور اپنے دل کا اطمینان کرے گا؟ وہ ضعیفی اور اپنے پوتے کے تاریک مستقبل پر کیا پردہ ڈالے گا؟ ان تمام سوالات نے میرے دل اور دماغ کے لیے جو فیصلہ

مہیّا کیا، یہ تھا کہ بڈّھے کا وہ پہلا صبر واستقامت ختم ہو چکا ہوگا۔

میں اسی فیصلے کو ساتھ لے کر بڈّھے کے گھر میں داخل ہوئی اور اس کی تازہ مصیبت پر افسوس کا اظہار کیا اور اسے اپنی ہمدری کا یقین دلایا۔ بڈّھا نہایت ہی امن وسکون سے میری دردمندانہ باتیں سنتا رہا لیکن جب اسے جواب کی نوبت آئی تو اس نے پھر انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی اور کہا: "میم صاحب! خدا کی تقدیر میں کوئی شخص دم نہیں مار سکتا۔ اسی نے دیا تھا اور وہی لے گیا۔ ہمیں ہر حال میں اس کا شکر واجب ہے۔"

لیڈی بارنس بڈّھے کے الفاظ نقل کرنے کے بعد پھر رکی، گویا کہ وہ مجھ سے ان الفاظ کی داد طلب کر رہی تھی۔ اس نے تھوڑا تامّل کیا جس میں ایک قسم کی محویّت ملی ہوئی تھی۔ لیڈی بارنس نے اپنا سلسلۂ کلام پھر شروع کیا اور کہا:

"ڈاکٹر صاحب! جب تک میں بڈّھے کے پاس بیٹھی رہی۔ نہ اس کے سینے سے آہ نکلی، نہ آنکھ سے آنسو گرا اور نہ زبان پر افسوس کا لفظ آیا۔ وہ اس طرح اطمینان کی باتیں کرتا تھا کہ گویا اس نے اکلوتے بیٹے اور بہو کو زمین میں دفن نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی کا کوئی بڑا فرض ادا کیا ہے۔

تھوڑا عرصہ بعد میں وہاں سے واپس آ گئی۔ میں بڈّھے کی پختگی ایمان پر بالکل حیرت زدہ تھی۔ میں بارہا غور کرتی تھی اور تھک جاتی تھی مگر مجھ پر یہ معمّا حل نہیں ہوتا تھا کہ اس پریشانی میں کسی انسان کو یہ استقامتِ حال کیسے نصیب ہوسکتی ہے؟

چند روز بعد اس کا معصوم پوتا بھی گزر گیا۔ اس اطلاع کے بعد میں نے اپنی اندازہ شناسی کے تمام پہلوؤں کو نئے سرے سے اپنے دماغ میں جمع کیا تا کہ اس کے حال کا اندازہ کروں۔ میں بڑی بے قراری کے عالم میں اس کے پاس گاؤں پہنچی۔ مجھے یقین تھا کہ اب لاوارث بڈّھا اپنی تمام دنیا کو ختم کر چکا ہوگا۔ اس کے حواس، ہوش سے بیگانہ ہوں گے۔ اس کے دل و دماغ مقفل ہوں گے اور یاس اس کی امید کے تمام رشتے منقطع کر چکی ہوگی۔ انھی توقعات کو ساتھ لے کر بڈّھے کے مکان میں داخل ہوئی اور نہایت ہی دل سوزی سے اس کے مصائب پر غم کا اظہار کیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے از بس حیرت ہوئی کہ میرے اظہارِ افسوس کا بڈھے کے دل پر کچھ بھی اثر نہ تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا اور نہایت ہی غیر متأثّر حالت سے میری گفتگو سن رہا تھا۔ جب میری گفتگو ختم ہوگئی تو بڈّھے نے زبان کھولی۔ اس نے پہلے کی طرح پھر اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی اور کہا:

"میم صاحب! یہ خدا کی حکمت کے کھیل ہیں۔ اس نے دیا تھا، واپس لے لیا۔ اس میں ہمارا کیا تھا جس پر ہم اپنے دل کو برا کریں۔ بندے کو ہر حال میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ ہم مسلمانوں کو یہی

حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر صبر کریں۔"

اب لیڈی بارنس در دِدل کی کیفیتوں سے لبریز تھی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور روتی ہوئی آواز میں کہا: ڈاکٹر صاحب! بڈّھے کا یہ جواب، میرے لیے قتل کا پیغام تھا۔ اس کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور تیر بن کر میرے دل کو کرید رہی تھی۔ اب میں نے اس مردِ ضعیف کی پختگیِ ایمان کے سامنے ہمیشہ کے لیے اپنا سر جھکا دیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اطمینانِ قلب مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اب میں نے کہا: اے میری بوڑھے باپ اب تم اکیلے اس گاؤں میں رہ کر کیا کرو گے۔ میرے ساتھ ہوٹل میں چلو اور آرام سے زندگی بسر کرو۔ یہاں وہ دن بھر میرے ہوٹل کی خدمت کرتا تھا اور رات کو خدا کی یاد میں مصروف ہوجاتا تھا۔

" کچھ عرصے کے بعد اس نے کہا کہ میں آج قبرستان کو جاؤں گا۔ میرے دل میں پھر وہی امتحان لینے کی لٹک پیدا ہوئی۔ دل نے کہا: یہ دیکھنا چاہیے کہ وہاں اس کے صبر وتحمل پر کیا گزرتی ہے؟ بڈّھا ہوٹل سے نکل کر اس خاموش اور ویران مقام کی طرف آیا جہاں اس کے تینوں عزیز مدفون تھے۔ میں ایک طرف کھڑی ہوگئی اور وہ قبرستان پہنچتے ہی پریشان حال قبروں کو درست کرنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ مٹی کھود کھود کر لاتا اور قبروں کو درست کرتا۔ جب قبریں درست ہوگئیں تو بڈّھے نے وضو کیا، ہاتھ اٹھائے اور اہلِ قبرستان کے حق میں دعا کی اور واپس چل دیا۔ میں نے اس تمام عرصے میں نہایت ہی احتیاط سے اس کی تمام حرکات کو دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے ہر کام میں اطمینان کا نور اور ایمان کی پختگی جلوہ گر ہے۔ اب میرے دل پر ایک غیبی نشتر چلا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ بڈّھے کی خوبی نہیں بلکہ یہ اس دینِ حق کی خوبی ہے جس کا یہ بڈّھا پیرو ہے۔ میں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا اور ہوٹل میں پہنچ کر بڈّھے سے کہا کہ وہ کوئی ایسی عورت بلا لائے جو مجھے اسلام کی تعلیم دے۔ بڈّھا فی الفور اٹھا اور اپنے ملّا کی لڑکی کو بلا لایا۔ اس نے مجھے خدا اور رسول ﷺ پر ایمان لانے کی ترغیب دی اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا سبق سکھایا۔

"ڈاکٹر صاحب! اب میں خدا تعالیٰ کے فضل و رحمت سے مسلمان ہوں اور وہی عظیم الشان قوتِ ایمان، جس سے کہ بڈّھے کا دل سیراب تھا، اپنے سینے میں موجود پاتی ہوں۔ اب مجھے اپنے خدا پر اِس قدر پختہ ایمان ہے کہ خواہ کس قدر بھی مصیبت آئے، میرے قدموں کو کبھی لغزش نہیں ہوسکتی۔"

جج کی بیوہ:

[اب قریشی صاحب دوسرے دن کی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں]۔

"۲۹ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں پھر حاضر ہوا۔ آپ آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ حقّہ چل رہا تھا۔ کل کی ملاقات میں آپ [نے لیڈی بارنس کے قبولِ اسلام کا واقعہ سنایا تھا۔ آج میں

نے دوسرا واقعہ] سنانے کی فرمائش کی تو آپ نے پہلے ایک تمہیدی تقریر ارشاد فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے:

"قبولِ اسلام میں اصل چیز "دل" ہے۔ جہاں دل ایک تبدیلی پر رضامند ہوجاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو بس باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہوجائے۔

"ہمیں اسلام کے قدیم اور جدید مبلّغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ قدیم مبلّغوں کا وار، غیر مسلمانوں کے دلوں پر تھا۔ وہ اپنی للّٰہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور احسان و مروّت کے [ذریعے] دلوں کو گرویدہ کرتے تھے اور اس طرح ہزار ہا لوگ، از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے، ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے مگر جدید مبلّغوں کا سارا زور، دماغ کی تبدیلی پر مرکوز ہوتا ہے۔ وہ صداقتِ اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں، مقابلے میں دوسری حجّت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں، اس پر بحث و تکرار شروع ہوجاتی ہے۔ مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے، غیر مسلم اپنے قوم پر تن جاتا ہے۔ اِس سے ضد پیدا ہوتی ہے اور ہدایت ختم ہوجاتی ہے۔

"مبلّغینِ اسلام کو دل متأثّر کرنے کے لیے نکلنا چاہیے یا دماغ؟ اس کے فیصلے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روِش کی پیروی کریں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فطرت، اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لیے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے۔ فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے اور آپ اسے بے اختیار کھا جاتے ہیں۔ اس وقت ایک شخص بھی دماغ سے یہ نہیں پوچھتا: کیا یہ کھانا طبّی لحاظ سے مفید ہوگا؟ آپ ایک ضروری کام پر جا رہے ہوتے ہیں کہ ناگہاں پھولوں کا ایک گلدستہ، خوش نما زمیں اور لبِ جو ایک حسین نظارہ سامنے آجاتا ہے؛ آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں۔ وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دل نواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس وقت کوئی شخص بھی دماغ سے یہ نہیں پوچھتا:

مجھے سونا چاہیے یا نہیں؟ مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اس طرح دلوں کو گرویدہ کر کے اپنا مطلب نکالتی ہے، وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی۔ اسلام چونکہ سربسر نورِ فطرت ہے، اس واسطے مبلّغینِ اسلام کو چاہیے کہ اخلاق و محبت کی گہرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت باقی نہ رہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مبلّغِ اسلام اسلامی کریکٹر کی عظمت کے مالک ہوں تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار، تو اس سے نہ تو دل مطمئن ہوسکتے ہیں، نہ منقلب ہوسکتے ہیں اور نہ فطرت رام ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "اب دیکھیے دل کی دنیا میں کیسی دلیلوں پر عمل کیا جاتا ہے؟ یہ چند ہی سال کا ذکر ہے کہ یہاں ایک ہندو جج کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد یکایک یہ خبر مشہور ہوئی کہ ان کی بیوہ

مشرف بہ اسلام ہو رہی ہے۔ یہاں کے ہندوؤں کو قدرتی طور پر اس واقعے سے تکلیف ہوئی۔عورت کے عزیز و اقارب جمع ہو گئے اور اسے سمجھانے لگے۔ سب نے مل کر زور ڈالا کہ وہ مسلمان ہونے کے خیال سے دستبردار ہو جائے لیکن اس تمام دباؤ کے باوجود، عورت کے ارادے میں ذرا بھی تزلزل نہ آیا۔

"عزیزوں کی ناکامی کے بعد دوسرا اِقدام جو اُٹھایا گیا، یہ تھا کہ ہندو دھرم کے مذہبی پنڈت اور پیشوا بلائے گئے۔ انھوں نے کتھائیں سنائیں، تاریخی حوالے دیے، مذہبی احکام بتائے، ہندو دھرم کی سچائی کی دلیلیں پیش کیں۔ تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا مگر عورت پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے تمام مذہبی احکام سن لیے۔ آخر میں صرف یہ کہہ دیا کہ میں ضرور مسلمان ہوں گی۔

"اب آریا سماج کے مبلّغ بلائے گئے۔ انھوں نے مخالفت کا دفتر کھولا، مسلمانوں کے مظالم پیش کیے، اسلامی احکام کی تردید کی، مسلمانوں سے نفرت دلائی۔ اورنگ زیب اور محمود غزنوی کا ذکر چھیڑا، گائے کے نام پر اپیل کی۔ یہ سلسلہ بھی کئی دن تک جاری رہا مگر عورت اب بھی اپنے ارادے پر محکم تھی۔

تیسرا قدم یہ تھا کہ عورت کو ڈرایا گیا، زدوکوب اور قتل کی دھمکی دی گئی۔ خوف کے ساتھ طمع کے مناظر بھی سامنے لائے گئے، مگر عورت اب بھی متأثّر نہ ہوئی۔

اب سوال و جواب شروع ہوئے۔ عورت سے پوچھا گیا: "تم کیوں مسلمان ہوتی ہو؟ کیا تمھیں مال و دولت کی خواہش ہے؟"

عورت نے کہا: "تم دیکھ رہے ہو، میرے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے؟"

پھر پوچھا گیا: "تمھیں کیا کوئی نفسانی خواہش ہے؟"

عورت نے جواب دیا: "تم میری عمر کو دیکھ رہے ہو، میں تو اب چند دن کی مہمان ہوں۔"

پھر پوچھا گیا: "کیا کسی مسلمان مولوی یا مبلّغ نے تمھیں بہکایا ہے؟"

عورت نے جواب دیا: "میں زندگی بھر کسی مولوی سے نہیں ملی۔"

رشتہ داروں نے پوچھا: "پھر کوئی اسلامی کتاب پڑھی ہو گی؟"

عورت نے کہا: "میں نے کوئی اسلامی کتاب دیکھی ہی نہیں۔"

اب لوگ متعجب ہوئے اور انھوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: "تو پھر تم کیوں مسلمان ہوتی ہو؟"

عورت نے کہا: میرے پتی سالہا سال تک سب جج رہے۔ وہ بیسیوں شہروں میں گئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھی۔ جس جگہ میں گئی، ہمیشہ اعلیٰ خاندان کی ہندو عورتوں کے ساتھ ہمارا تعلق رہا۔ مسلمان عورتیں بھی کبھی ہمارے گھر آتی تھیں مگر یہ سب خدمت گار ہوتی تھیں۔ کبھی اسماعیل بہشتی کی بیوی ہمارے ہاں آجاتی، کبھی دھوبن کی لڑکیاں آجاتیں، کبھی کسی مسلمان پنساری کو ہم خود بلا لیتے تھے۔ بس اِس سے

زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔

"سامعین میں ذرا امید پیدا ہوئی اور انھوں نے کہا: پھر تو کوئی وجہ نہیں کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔

"عورت نے بیان کیا: بے شک، جن مسلمان عورتوں سے میں ملی، وہ اکثر غریب محتاج اور میلی تھیں۔ متموّل گھرانے کی مسلمان عورتوں سے ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر ہندو عورتیں جن کے ساتھ رات اور دن میری نشست و برخاست تھی، سب امیر، متموّل اور روشن خیال تھیں۔ اس تفاوت کے باوجود میں نے ہر جگہ ہندو اور مسلمان عورتوں میں ایک واضح فرق دیکھا ہے۔ اس آخری جملے پر تمام سننے والوں کے دل دھڑکنے لگے۔ سب کی نگاہیں بے اختیار عورت کی طرف جھک گئیں۔ ہر شخص حیرت اور اضطراب کی تصویر بن گیا اور دوسرے جملے کا انتظار کرنے لگا۔ عورت نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"فرق یہ ہے کہ جس قدر بھی ہندو عورتوں سے ملی ہوں، ان کے جسموں سے مجھے ایک قسم کی بُو ضرور آئی مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہر جگہ دیکھا کہ غریب سے غریب مسلمان عورتوں کے جسم میں یہ بُو موجود نہ تھی۔ میں اپنے پتی کی زندگی سے لے کر اب تک اس تفاوت پر غور کرتی رہی ہوں لیکن سبب معلوم نہیں کر سکی۔ اب چند روز ہوئے میں نے اس راز کو معلوم کر لیا ہے، میں نے معلوم کر لیا ہے کہ مسلمان چوں کہ خدا پرست اور ایمان دار ہیں اور ان کی روح پاک ہے، اس واسطے ان کے جسموں سے بُو نہیں آتی۔ وہ صاف کپڑے پہنیں یا نا صاف، ان کے جسم بُو سے پاک ہوتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ہندو (جو کہ مشرک ہیں اور ان کی روح پاک نہیں ہے) اس واسطے خواہ وہ کس قدر بھی صاف اور پر تکلّف لباس پہنیں، ان کے جسم بُو سے پاک نہیں ہوتے۔ اس اعلان کے بعد عورت کی آنکھیں ڈوب گئیں۔ اس کے چہرے پر جوشِ ایمان کی سرخیاں دوڑنے لگیں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے رشتہ داروں کو متنبّہ کیا: "مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو، میں اسلامی توحید کے نور سے اپنی روح کو پاک کرنا چاہتی ہوں۔ اس واسطے میں ضرور مسلمان ہوں گی۔"

اسی وقت عورت نے اپنے غضبناک رشتہ داروں کے سامنے کلمہ پڑھا۔ وہ عورت کے بیان پر بہت سٹپٹائے مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ عورت اپنے اصرار پر قائم رہی اور بالآخر مسلمان ہوگئی۔"

——— مرسلہ: پروفیسر ظفر حجازی

❁ ❁ ❁

حوالہ جات وحواشی

۱- خواجہ حسن نظامی (۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء-۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء) معروف صاحبِ طرز ادیب اور صحافی۔ علّامہ اقبال کے

بے تکلّف دوست۔ اُن کے نام علّامہ اقبال کے ۲۰ خطوط ملتے ہیں۔ تصانیف کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔

۲- شیخ عبد القادر (۱۵ مارچ ۱۸۷۸ء-۹فروری ۱۹۵۰ء) ماہ نامہ مخزن کے بانی مدیر۔ صدر انجمن حمایت اسلام، لاہور۔ صدر انجمن ترقی اردو پاکستان۔ صدر پنجاب قانون ساز اسمبلی۔ بہاول پور اور لاہور کی ہائی کورٹوں کے جج رہے۔ اردو انگریزی میں تقریباً دس کتابوں کے مصنف و مؤلف۔ ممتاز قانون دان۔

۳- میر غلام بھیک نیرنگ (۲۶ ستمبر ۱۸۷۶ء-۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء) سیاست دان، شاعر اور ادیب۔ تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن۔ اقبال کے بے تکلف دوست۔ انڈین قانون ساز اسمبلی کے رکن۔ دستور ساز اسمبلی پاکستان کے رکن۔ دو شعری مجموعے (کلام نیرنگ۔ غبارِ افق) ان سے یادگار ہیں۔ اقبال پر ان کا معرکہ آرا مضمون: "اقبال کے بعض حالات"، رسالہ اقبال لاہور (اکتوبر ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا جو حیاتِ اقبال کے بنیادی مآخذ میں شمار ہوتا ہے۔

۴- نواب سر ذوالفقار علی خان (م: ۲۶ مئی ۱۹۳۳ء) ریاست مالیر کوٹلہ کے وزیر اعظم۔ علّامہ اقبال کے بے تکلف دوست۔ انھوں نے اقبال پر انگریزی میں سب سے پہلے *A Voice from the East* کے نام سے اعلیٰ درجے کی ایک کتاب لکھی تھی۔

۵- علّامہ اقبال کا، وکالت کا دفتر، نئی انارکلی بازار میں اس مکان میں واقع تھا، جہاں اُن سے پہلے ان کے دو وکیل دوست سر محمد شفیع اور سر فضل حسین مقیم رہے۔ یہ جگہ چیف کورٹ کے قریب تھی۔

۶- مولانا تاجور نجیب آبادی (اصل نام: احسان اللہ خاں دُرّانی۔ ۱۸۹۰ء-۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء) نام ور شاعر، صحافی، عالم دین اور معلم۔ بانی مدیر ادبی دنیا لاہور۔ مدیر: مخزن لاہور۔ مدیر: شاہکار، لاہور۔ نگرانِ اعلیٰ اردو مرکز لاہور۔ شاعری میں احسان دانش کے استاد۔ دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو کے استاد رہے۔

۷- آخری زمانے میں اقبال کی آمدنی کے ذرائع بہت کم ہو گئے تھے چنانچہ سر راس مسعود کی کوششوں سے نواب بھوپال (حمید اللہ خان) نے مئی ۱۹۳۵ء سے تاحیات، اقبال کے لیے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ (شاید مولانا تاجور کو علم نہ تھا کہ وظیفے کی رقم تین سو روپے نہیں، پانچ سو روپے ماہانہ تھی۔) راس مسعود کی کوشش تھی کہ ریاست بہاول پور اور ریاست حیدر آباد دکن کی طرف سے بھی وظیفہ مقرر ہو جائے مگر اقبال نے انھیں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ پانچ سو روپے کی رقم میرے لیے کافی ہے۔

وضاحت: حواشی و تعلیقات میں حوالے کی مختلف کتابوں (زیادہ تر ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ کی بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ) سے استفادہ کیا گیا ہے۔